

تفہیم القرآن

الرحمن

نام | پہلے ہی لفظ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورہ ہے جو لفظ الرحمن سے شروع ہوتی ہے۔ تاہم اس نام کو سورہ کے مضمون سے بھی گہری مناسبت ہے، کیونکہ اس میں شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کے مظاہر و ثمرات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

زمانہ نزول | علمائے تفسیر بالعموم اس سورہ کو کئی تزار دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس اور عکرمہ اور قتادہ سے یہ قول منقول ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے، لیکن اولیٰ تو انہی بزرگوں سے بعض دوسری روایات اس کے خلاف بھی منقول ہوتی ہیں، دوسرے اس کا مضمون مدنی سورتوں کی بہ نسبت کئی صورتوں سے زیادہ مشابہ ہے، بلکہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ مکہ کے بھی ابتدائی دور کی معلوم ہوتی ہے۔ اور مزید برآں متعدد مقبرہ روایات سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ مکہ منظر ہی میں ہجرت سے کئی سال قبل نازل ہوئی تھی۔

مسند احمد میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ وہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرم میں خانہ کعبہ کے اُس گوشے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا جس میں حجر اسود نصب ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جبکہ ابھی فَاَصْدَخَ بِمَا قَوْلُهُمْ حُنَّ حِزْبٍ کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو، کافر ابی نازل نہیں ہوا تھا۔ مشرکین اس ناز میں آپ کی زبان سے قِيَايَةِ الْاَآءِ رَتِّبْنَا تَكْدِيبَانَ کے الفاظ سن رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورہ سورہ الجمر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

الْبَزَّارِ، ابْنِ جَرِيرٍ، ابْنِ الْمُثَنَّبِ، دَارِ قُطَيْبِ بْنِ الْأَفْرَادِ، ابْنِ مَرْوَانَ، وَأُورِ الْخَلْبِيِّ رَفِي التَّارِيخِ،
 نے حضرت عبدالقدوس عمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 سورہ رحمن خود تلاوت فرمائی، یا آپ کے سامنے یہ سورہ پڑھی گئی۔ پھر آپ نے لوگوں سے فرمایا
 کہ کیا وجہ ہے کہ میں تم سے ویسا اچھا جواب نہیں سُن رہا ہوں جیسا جنوں نے اپنے رب کو دیا تھا؟
 لوگوں نے عرض کیا وہ کیا جواب تھا؟ آپ نے فرمایا کہ ”جب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد قَبَائِي
 الْآعْرَابِ كَيْمَا تَنْكَلِدَانِ پڑھتا تو جن اس کے جواب میں کہتے جاتے تھے کہ لَا بَشِيئَةَ مِنْ نِعْمَةِ
 رَبِّنَا نَكَلِدُ، ہم اپنے رب کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے“

اسی سے بتا جتنا مضمون ترمذی، حاکم اور حافظ ابوبکر بزار نے حضرت جابر بن عبداللہ سے
 نقل کیا ہے۔ اُن کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب لوگ سورہ رحمن کو سُن کر خاموش رہے تو حضور
 نے فرمایا لَقَدْ قَرَأْتُمْ عَلَي الْجَنِّ يَدِيَةَ الْحَيِّتِ فَكَانُوا أَحْسَنَ مِنْ دُودِ الْمَنَكْرِ، كُنْتُمْ كَلِمًا
 اتَّبَعْتُمْ عَلَي قَوْلِهِ قَبَائِي الْآعْرَابِ كَيْمَا تَنْكَلِدَانِ قَالُوا لَا بَشِيئَةَ مِنْ نِعْمَتِكَ رَبَّنَا
 نَكَلِدُ فَلَمَّا كَلَّمَكَ الْحَمْدُ - یعنی میں نے یہ سورہ اُس رات جنوں کو سنائی تھی جس میں وہ قرآن
 سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہ اس کا جواب تم سے بہتر دے رہے تھے۔ جب میں اللہ تعالیٰ
 کے اس ارشاد پر پہنچتا تھا کہ اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ تو وہ
 اس کے جواب میں کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار، ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، حمد
 تیرے ہی لیے ہے“

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورہ اتحاف آیات ۲۹-۳۲ میں رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جنوں کے قرآن سننے کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، اُس موقع پر
 حضور نماز میں سورہ رحمن تلاوت فرما رہے تھے۔ یہ سلسلہ نبوی کا واقعہ ہے جب آپ سفر
 طائف سے واپسی پر نخلہ میں کچھ مدت ٹھہرے تھے۔ اگرچہ بعض دوسری روایات میں یہ بیان
 کیا گیا ہے کہ اُس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ جن آپ سے قرآن

سن رہے ہیں بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دی کہ وہ آپ کی تلامذت سن رہے تھے، لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضور کو جنوں کی سماعت قرآن پر مطلقاً نبیاً تھا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو یہ اطلاع بھی دے دی ہو کہ سورہ رحمن سنتے وقت وہ اس کا کیا جواب دیتے جا رہے تھے۔

ان روایات سے تو صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ سورہ رحمن سورہ بقرہ اور سورہ اُحزاب سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ایک اور روایت ہمارے سامنے آتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ ابن اسحاق حضرت عروہ بن زبیر سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک روز صحابہ کرام نے آپس میں کہا کہ قریش نے کبھی کسی کو علانیہ باوازا بلند قرآن پڑھتے نہیں سنا ہے، ہم میں کون ہے جو ایک دفعہ اُن کو یہ کلام پاک سنا ڈالے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا میں یہ کام کرتا ہوں صحابہ نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ وہ تم پر زیادتی کریں گے۔ ہمارے خیال میں کسی ایسے شخص کو یہ کام کرنا چاہیے جس کا خاندان زبردست ہو، تاکہ اگر قریش کے لوگ اس پر دست درازی کریں تو اس کے خاندان والے اس کی حمایت پر اٹھ کھڑے ہوں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا مجھے یہ کام کڑوانے دو، میرا محافظ اللہ ہے۔ پھر وہ دن چڑھے حرم میں پہنچے جبکہ قریش کے سردار وہاں اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہ نے مقام ابراہیم پر پہنچ کر پورے زور سے سورہ رحمن کی تلامذت شروع کر دی۔ قریش کے لوگ پہلے تو سوچتے رہے کہ عبداللہ کیا کہہ رہے ہیں پھر جب انہیں پتہ چلا کہ یہ وہ کلام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر تھپڑ مارنے لگے۔ مگر حضرت عبداللہ نے پروا نہ کی۔ بیٹھے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب تک ان کے دم میں دم رہا قرآن سناٹے چلے گئے۔ آخر کار جب وہ اپنا سوجھا ہوا منہ لے کر بیٹھے تو سامنے والوں نے کہا ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا۔ انہوں نے جواب دیا آج سے بڑھ کر یہ خدا کے دشمن میرے لیے کبھی ہلکے نہ تھے، تم کہو تو کل

پھر انہیں قرآن سناؤں۔ سب نے کہا، بس اتنا ہی کافی ہے جو کچھ وہ نہیں سنا چاہتے تھے وہ تم نے انہیں سنا دیا۔ دسیرۃ ابن ہشام، جلد اول، ص ۳۳۶،

موضوع اور مضمون | قرآن مجید کی یہ ایک ہی سورۃ ہے جس میں انسان کے ساتھ زمین کی دوسری با اختیار مخلوق، جنوں کو بھی براہ راست خطاب کیا گیا ہے، اور دونوں کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات، اُس کے بے حد و حساب احسانات، اس کے مقابلہ میں اُن کی عاجزی و بے بسی اور اس کے حضور اُن کی جواہدہی کا احساس دلا کر اُس کی نافرمانی کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے اور فرمانبرداری کے بہترین نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرح جن بھی ایک ذی اختیار اور جواب دہ مخلوق ہیں جنہیں کفر و ایمان اور طاعت و عصیان کی آزادی بخشی گئی ہے، اور ان میں بھی انسانوں کی طرح کافر و مومن اور مطیع و سرکش پاتے جلتے ہیں، اور ان کے اندر بھی ایسے گروہ موجود ہیں جو انبیاء علیہم السلام اور کاتب آسمانی پر ایمان لاتے ہیں، لیکن یہ سورۃ اس امر کی قطعی صراحت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی دعوت جن اور انس دونوں کے لیے ہے اور حضور کی رسالت صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے۔ سورۃ کے آغاز میں تو خطاب کا رُخ انسانوں کی طرف ہی ہے، کیونکہ زمین کی خلافت انہی کو حاصل ہے، خدا کے رسول انہی میں سے آتے ہیں، اور خدا کی کتاب انہی کی زبانوں میں نازل کی گئی ہے، لیکن آگے چل کر آیت ۳ سے انسان اور جن دونوں کو یکساں مخاطب کیا گیا ہے اور ایک ہی دعوت دونوں کے سامنے پیش کی گئی ہے۔

سورۃ کے مضامین چھوٹے چھوٹے فقرہوں میں ایک خاص ترتیب سے ارشاد ہوتے ہیں : آیت ۱ سے ۱۰ تک یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ اس قرآن کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ عین اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اس تعلیم سے نوری انسان کی ہر ایت کا سامان کرے، کیونکہ انسان کو ایک ذی عقل و شعور مخلوق کی حیثیت سے اسی نے پیدا کیا ہے۔

آیت ۵-۶ میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کا سارا نظام اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی میں چل رہا ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز اس کی تابع فرمان ہے۔ یہاں کوئی دوسرا نہیں ہے جس کی خدائی چل رہی ہو۔

آیت ۷-۹ میں ایک دوسری اجم حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اس پورے نظام کو ٹھیک ٹھیک توازن کے ساتھ عدل پر قائم کیا ہے اور اس نظام کی فطرت یہ پابندی ہے کہ اس میں رہنے والے اپنے حدود و اختیار میں بھی عدل ہی پر قائم ہوں اور توازن نہ بھاریں۔ آیت ۱۰ سے ۲۵ تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائب و کمالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی ان نعمتوں کی طرف اشارے کئے ہیں جن سے انسان اور جن متمتع ہو رہے ہیں۔

آیت ۲۶ سے ۳۰ تک انسان اور جن دونوں کو یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کوئی غیر فانی اور لازوال نہیں ہے، اور چھوٹے سے بڑے تک کوئی موجود ایسا نہیں جو اپنے وجود اور ضروریات وجود کے لیے خدا کا محتاج نہ ہو۔ زمین سے لے کر آسمانوں تک شب و روز جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسی کی کار فرمائی سے ہو رہا ہے۔

آیت ۳۱ سے ۴۶ تک ان دونوں گروہوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب تم سے باز پرس کی جائے گی۔ اس باز پرس سے بچ کر تم کہیں نہیں جاسکتے۔ خدا کی خدائی تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اُس سے نکل کر بھاگ جانا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ اگر تم اس گھنڈ میں مبتلا ہو کہ اُس سے بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔

آیات ۴۷-۴۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہ باز پرس قیامت کے روز ہونے والی ہے۔

آیت ۴۹ سے ۵۴ تک اُن مجرم انسانوں اور جنوں کا انجام بتایا گیا ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے رہے ہیں۔

اور آیت ۵۶ سے آخر سورت تک تفصیل کے ساتھ وہ انعامات بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں اُن نیک انسانوں اور جنوں کو عطا کیے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں خدا ترسی کی زندگی بسر

کی ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کام کیا ہے کہ ہمیں ایک روز اپنے رب کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

یہ پوری تقریر خطابت کی زبان میں ہے۔ ایک پرجوش اور نہایت بیخ خطبہ ہے جس کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ایک ایک عجوبے، اور اس کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک ایک نعمت، اور اس کی سلطانی وقہاری کے مظاہر میں سے ایک ایک مظہر، اور اس کی جزا و سزا کی تفصیلات میں سے ایک ایک چیز کو بیان کر کے بار بار جن و انس سے سوال کیا گیا کہ فَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَكْفُرُوا بآيَاتِنَا - آگے چل کر ہم اس کی وضاحت کریں گے کہ آلا و ایک وسیع المعنی لفظ ہے جس کو اس خطبے میں مختلف مواقع پر مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور جن و انس سے یہ سوال ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے اپنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

رحمان نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بونا سکھایا

یعنی اس قرآن کی تعلیم کسی انسان کی طبعاً نہیں ہے بلکہ اس کا معلم خود خدا ہے رحمان ہے اس مقام پر یہ بات بیان کرنے کی حاجت نہیں تھی کہ اللہ نے قرآن کی تعلیم کس کو دی ہے، کیونکہ لوگ اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن رہے تھے، اس لیے مقتضائے حال سے کلام کا یہ مدعا آپ سے آپ ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔

آغاز اس فقرے سے کرنے کا پہلا مقصد تو یہی بتانا ہے کہ حضور خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ اس تعلیم کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ مزید برآں دوسرا ایک مقصد اور بھی ہے جس کی طرف لفظ رحمان اشارہ کر رہا ہے۔ اگر بات صرف اتنی ہی کہنی ہوتی کہ یہ تعلیم اللہ کی طرف سے ہے، نبی کی طبعاً نہیں ہے تو اللہ کا اسم ذات چھوڑ کر کوئی اسم صفت استعمال کرنے کی حاجت نہ تھی، اور اسم صفت ہی استعمال کرنا ہوتا تو محض اس معنوں کو ادا کرنے کے لیے اسلئے الہیہ میں سے کوئی اسم بھی اختیار کیا جاسکتا تھا۔ لیکن

جب یہ کہنے کے بجائے کہ اللہ نے، یا خالق نے، یا رزاق نے یہ تعلیم دی ہے، فرمایا یہ گیا کہ اس قرآن کی تعلیم جن نے دی ہے، تو اس سے خود بخود یہ مضمون نکل آیا کہ بندوں کی ہدایت کے لیے قرآن مجید کا نازل کیا جانا سراسر اللہ کی رحمت ہے۔ وہ چونکہ اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان ہے، اس لیے اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ نہیں تاریکی میں بھٹکتا چھوڑ دے، اور اُس کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوتی کہ یہ قرآن بھیج کر تمہیں وہ علم عطا فرمائے جس پر دنیا میں تمہاری راست روی اور آخرت میں تمہاری فلاح کا انحصار ہے۔

۳۔ بافاظ دیگر، چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے، اور خالق ہی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی مخلوق کی رہنمائی کرے اور اُسے وہ راستہ بتائے جس سے وہ اپنا مقصد وجود پورا کر سکے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی اس تعلیم کا نازل ہونا محض اُس کی رحمانیت ہی کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ اُس کے خالق ہونے کا بھی لازمی اور فطری تقاضا ہے۔ خالق اپنی مخلوق کی رہنمائی نہ کہے گا تو اور کون کرے گا؟ اور خالق ہی رہنمائی نہ کہے تو اور کون کر سکتا ہے؟ اور خالق کے لیے اس سے بڑا عجیب اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس چیز کو وہ وجود میں لائے اسے اپنے وجود کا مقصد پورا کرنے کا طریقہ نہ سکھائے؟ پس درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی تعلیم کا انتظام ہونا عجیب بات نہیں ہے، بلکہ یہ انتظام اگر اس کی طرف سے نہ ہوتا تو قابل تعجب ہوتا۔ پوری کائنات میں جو چیزیں اُس نے بنائی ہیں اس کو محض پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس کو وہ موزوں ترین ساخت دی ہے جس سے وہ نظام فطرت میں اپنے حصے کا کام کرنے کے قابل ہو سکے، اور اس کام کو انجام دینے کا طریقہ اسے سکھایا ہے۔ خود انسان کے اپنے جسم کا ایک ایک رونگٹا اور ایک ایک خلیہ وہ کام سیکھ کر پیدا ہوا ہے جو اسے انسانی جسم میں انجام دینا ہے۔ پھر آخر انسان یسے خود اپنے خالق کی تعلیم و رہنمائی سے بے نیاز یا محروم کیسے ہو سکتا تھا؟ قرآن مجید میں اس مضمون کو مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے سمجھایا گیا ہے۔ سورہ نمل آیت ۱۲، میں فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَرَهْنٰمٰى كَرٰنَا ہِمَارِى ذَمْرٍ وَاْرِى ہِیْ "سورہ نمل آیت ۹، میں ارشاد ہُوَا وَّعَلٰى اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَہِنْمَا جَارِئُوْا" یہ اللہ کے ذمہ ہے کہ سیدھا راستہ بتائے اور ٹیڑھے راستے بہت سے ہیں "سورہ طہ آیت ۴۷-۵۰، میں ذکر آتا ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کی زبان سے پیغام رسالت سُن کر حیرت سے پوچھا کہ آخر وہ

سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔

تہا رب کرنا ہے جو میرے پاس رسول بھیجتا ہے، تو حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ۔ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص ساخت عطا کی اور پھر اس کی رہنمائی فرمائی، یعنی وہ طریقہ سکھایا جس سے وہ نظام وجود میں اپنے حصے کا کام کر سکے۔ یہی وہ دلیل ہے جس سے ایک غیر متعصب ذہن اس بات پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ انسان کی تعلیم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں اور کتابوں کا آنا عین تعاضلے فطرت ہے۔

۳۔ اصل میں لفظ بیان استعمال ہوا ہے۔ اس کے ایک معنی تو اظہارِ مافی الضمیر کے ہیں، یعنی بولنا اور اپنا مطلب و مقصد بیان کرنا۔ اور دوسرے معنی ہیں فرق و امتیاز کی وضاحت، جس سے مراد اس مقام پر خیر و شر اور بھلائی اور بُرائی کا امتیاز ہے۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا فقرہ اوپر کے استدلال کو مکمل کر دیتا ہے۔ بولنا وہ امتیازی وصف ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری ارضی مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ محض قوتِ گویائی ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے عقل و شعور، فہم و ادراک، تمیز و ارادہ اور دوسری ذہنی قوتیں کار فرما ہوتی ہیں جن کے بغیر انسان کی قوتِ ناطقہ کام نہیں کر سکتی۔ اس لیے بولنا دراصل انسان کے ذی شعور اور ذی اختیار مخلوق ہونے کی صریح علامت ہے۔ اور یہ امتیازی وصف جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے تعلیم کی نوعیت بھی وہ نہیں ہو سکتی جو بے شعور اور بے اختیار مخلوق کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اسی طرح انسان کا دوسرا اہم ترین امتیازی وصف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایک اخلاقی حس رکھ دی ہے جس کی وجہ سے وہ فطری طور پر نیکی اور بدی، حق اور ناحق، ظلم اور انصاف، بجا اور بے جا کے درمیان فرق کرتا ہے، اور یہ وجدان اور احساسِ انتہائی گراہی و جہالت کی حالت میں بھی اُس کے اندر سے نہیں نکلتا۔ ان دونوں امتیازی خصوصیات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کی شعوری و اختیاری زندگی کے لیے تعلیم کا طریقہ اُس پیدائشی طریقِ تعلیم سے مختلف ہو جس کے تحت مچھلی کو تیرنا اور پرندے کو اڑنا، اور خود انسانی جسم کے اندر پیک کو جھپکنا، آنکھ کو دیکھنا، کان کو سننا اور معدے کو ہضم کرنا سکھایا گیا ہے۔ انسان خود اپنی زندگی کے اس شعبے میں اُستاد اور کتاب اور مدرسے

اور تبلیغ و تلقین اور تحریر و تقریر اور بحث و استدلال جیسے ذرائع ہی کہ وسیلہ تعلیم مانتا ہے اور پیدا ہونے والی علم و شعور کو کافی نہیں سمجھتا۔ پھر یہ بات آخر کیوں عجیب ہو کہ انسان کے خالق پر اُس کی رہنمائی کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسے ادا کرنے کے لیے اس نے رسول اور کتاب کو تعلیم کا ذریعہ بنایا ہے جیسی مخلوق ویسی ہی اُس کی تعلیم۔ یہ سراسر ایک مقبول بات ہے۔ ”بیان“ جس مخلوق کو سکھا یا گیا ہو اس کے لیے ”قرآن“ ہی ذریعہ تعلیم ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی ایسا ذریعہ جو ان مخلوقات کے لیے مرزوں ہے جنہیں بیان نہیں سکھا یا گیا ہے۔

۵۔ یعنی ایک زبردست قانون اور ایک اٹل ضابطہ ہے جس سے یہ عظیم اشیانہ تیارے بندھے ہوئے ہیں۔ انسان وقت اور دن اور تاریخوں اور فصلوں اور موسموں کا حساب اسی وجہ سے کر رہا ہے کہ سورج کے طلوع و غروب اور مختلف فاصلوں سے اس کے گزرنے کا جو قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہے اُس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ زمین پر بے حد و حساب مخلوق زندہ ہی اس وجہ سے ہے کہ سورج اور چاند کو ٹھیک ٹھیک حساب کے زمین سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے اور اس فاصلے میں کمی و بیشی صحیح ناپ تول سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ ہوتی ہے۔ ورنہ زمین سے ان کا فاصلہ کسی حساب کے بغیر بڑھ یا گھٹ جائے تو یہاں کسی کا جینا ہی ممکن نہ رہے۔ اسی طرح زمین کے گرد چاند اور سورج کے درمیان حرکات میں ایسا مکمل تناسب قائم کیا گیا ہے کہ چاند ایک عالمگیر خبثت بن کر رہ گیا ہے جو پوری باقاعدگی کے ساتھ ہر رات ساری دنیا کو قریب تاریخ بنا دیتی ہے۔

۶۔ اصل میں سطر الجحیم استعمال ہوا ہے جس کے معرود اور تباہی در معنی ٹاؤسے کے ہیں لیکن لغت عرب میں یہ لفظ ایسے پردوں اور سیل بوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن کا تباہی نہیں ہوتا، مثلاً تکراریاں، خربزے، تریز و غیرہ۔ معتبرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، سدی اور صفیان ثوری اس کو پلے تنے والی نباتات کے معنی میں لیتے ہیں، کیونکہ اس کے بعد لفظ الشجر و درخت استعمال فرمایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی معنی زیادہ مناسب رکھتے ہیں۔ مجلات اس کے مجاہد، قواد اور جن بصری کہتے ہیں کہ تخم سے مراد یہاں بھی زمین کے بوٹے نہیں بلکہ آسمان کے تارے ہی ہیں، کیونکہ یہی اس کے معرود معنی میں، اس لفظ کو سن کر سب سے پہلے آری کا

آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو

زمین اسی معنی کی طرف جاتا ہے، اور شمس، و قمر کے بعد تاروں کا ذکر باکل فطری مناسبت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مفسرین و مترجمین کی اکثریت نے اگرچہ پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، اور اُس کو بھی غلط نہیں کہا جاسکتا، لیکن ہمارے نزدیک حافظ ابن کثیر کی یہ رائے صحیح ہے کہ زبان اور مضمون دونوں کے لحاظ سے دوسرا مفہوم زیادہ قابل ترجیح نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر بھی نجوم اور شجر کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر آیا ہے اور وہاں نجوم کو تاروں کے سوا اور کسی معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں اَلْجِبَالُ وَاللّٰهُ يَسْجُدُ لَهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ مِنَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُوْمِ وَالْجِبَالِ وَالشَّجَرِ وَالدَّوَابِّ وَكَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ... (الحج - ۱۸) یہاں نجوم کا ذکر شمس و قمر کے ساتھ ہے اور شجر کا ذکر پہاڑوں اور جانوروں کے ساتھ، اور فرمایا گیا ہے کہ یہ سب اللہ کے آگے سجدہ ریز ہیں۔

یعنی آسمان کے تارے اور زمین کے درخت، سب اللہ تعالیٰ کے مطیع فرمان اور اس کے قانون کے پابند ہیں جو ضابطہ ان کے لیے بنا دیا گیا ہے اس سے یک سر مو تجاوز نہیں کر سکتے۔

ان دونوں آیتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کائنات کا سامان نظام اللہ تعالیٰ کا آفریدہ ہے اور اس کی اطاعت میں چل رہا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک نہ کوئی خود مختار ہے، نہ کسی اور کی خدائی اس جہان میں چل رہی ہے، نہ خدا کی خدائی میں کسی کا کوئی دخل ہے، اور نہ کسی کا یہ مقام ہے کہ اسے معبود بنا یا جلتے۔ سب بندے اور غلام ہیں، آقا تنها ایک ربّ قدیر ہے۔ لہذا توحید ہی حق ہے جس کی تعلیم یہ قرآن دے رہا ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو شخص بھی شرک یا کفر کر رہا ہے وہ دراصل کائنات کے پورے نظام سے برسرِ پیکار ہے۔

۷۔ قریب قریب تمام مفسرین نے یہاں میزان و ترازو سے مراد عدل لیا ہے، اور میزان قائم کرنے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اس پورے نظام کو عدل پر قائم کیا ہے۔ یہ بے حدود و تارے اور سیارے جو فضا میں گھوم رہے ہیں، یہ عظیم اشیان قوتیں جو اس عالم میں کام کر رہی ہیں، اور یہ لاتعداد مخلوقات اور اشیاء جو اس جہان میں پائی جاتی ہیں، ان سب کے درمیان اگر کمالی درجہ کا عدل و توازن قائم

انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔

زمین کو اس نے سب مخلوقات کے لیے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں کھجور

کیا گیا ہوتا تو یہ کارگاہ ہستی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکتی تھی۔ خود اس زمین پر کہ وڑوں برس سے ہوا اور پانی اور خشکی میں جو مخلوقات موجود ہیں انہی کو دیکھ لیجیے۔ اُن کی زندگی اسی لیے تو برقرار ہے کہ ان کے اسباب حیات میں پورا پورا عدل اور توازن پایا جاتا ہے، ورنہ ان اسباب میں ذرہ برابر بھی بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو یہاں زندگی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

یعنی چونکہ تم ایک متوازن کائنات میں رہتے ہو جس کا سارا نظام عدل پر قائم کیا گیا ہے اس لیے تمہیں بھی عدل پر قائم ہونا چاہیے۔ جس دائرے میں تمہیں اختیار دیا گیا ہے اس میں اگر تم بے انصافی کرو گے اور جن حق داروں کے حقوق تمہارے ہاتھ میں دیئے گئے ہیں اگر تم ان کے حق مارو گے تو یہ فطرت کائنات سے تمہاری بغاوت ہوگی۔ اس کائنات کی فطرت ظلم و بے انصافی اور حق ماری کو قبول نہیں کرتی۔ یہاں ایک بڑا ظلم تو درکنار ترازو میں ڈنڈی مار کر اگر کوئی شخص خریدار کے حق کی ایک تولہ بھر چیز بھی مار بیٹتا ہے تو میزان عالم میں خلل برپا کر دیتا ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم کا دوسرا اہم حصہ ہے جو ان تین آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلی تعلیم ہے توحید۔ اور دوسری تعلیم ہے عدل۔ اس طرح چند مختصر فقروں میں لوگوں کو بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی رہنمائی کے لیے خدا نے جو قرآن بھیجا ہے وہ کیا تعلیم لے کر آیا ہے۔

۵۵ اب یہاں سے آیت ۵۴ تک اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں اور اس کے اُن احسانات اور اُس کی قدرت کے اُن کرشموں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے انسان اور جن دونوں متمتع ہو رہے ہیں اور جن کا فطری اور اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ کفر و ایمان کا اختیار رکھنے کے باوجود خود اپنی مرضی سے بطور و رغبت اپنے رب کی بندگی اور اطاعت کا راستہ اختیار کریں۔

تہ اصل الفاظ ہیں زمین کو "آنام" کے لیے وضع کیا۔ وضع کرنے سے مراد ہے تالیف کرنا، بنانا، بتا کرنا، رکھنا، ثبت کرنا۔ اور آنام عربی زبان میں خلق کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں انسان اور دوسری سب زندہ مخلوقات شامل ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کل شیء فیہ الروح، ہر ذی روح آنام میں شمار ہوتا ہے۔

کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں جھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔ پس اسے جن دانس، تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

مجاہد اس کے معنی بیان کرتے ہیں خلعتی۔ قتادہ، ابن زید، اور شعبی کہتے ہیں کہ سب جاندار اناام ہیں جن بصری کہتے ہیں کہ انس و جن دونوں اس کے مفہوم میں داخل ہیں یہی معنی تمام اہل لغت نے بیان کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اس آیت سے زمین کو ریاست کی ملکیت بنانے کا حکم نکالتے ہیں وہ ایک فضول بات کہتے ہیں۔ یہ باہر کے نظریات لاکر قرآن میں زبردستی ٹھونسنے کی ایک جھوٹی کوشش ہے جس کا ساتھ نہ آیت کے الفاظ دیتے ہیں نہ سیاق و سباق۔ اناام صرت انسانی معاشرے کو نہیں کہتے بلکہ زمین کی دوسری مخلوقات بھی اس میں شامل ہیں۔ زمین کو اناام کے لیے وضع کرنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ وہ سب کی مشترک ملکیت ہو، اور سیاق عبارتت بھی یہ نہیں بنا رہا ہے کہ کلام کا مدعا اس بلکہ کوئی معاشی ضابطہ بیان کرنا ہے۔ یہاں تو مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو اس طرح بنایا اور تیار کر دیا کہ یہ قسم قسم کی زندہ مخلوقات کے لیے رہنے بسنے اور زندگی بسر کرنے کے قابل ہوگئی۔ یہ آپ سے آپ ایسی نہیں ہوگئی ہے۔ خالق کے بنانے سے ایسی بنی ہے اُس نے اپنی حکمت سے اس کو ایسی جگہ رکھا اور ایسے حالات اُس میں پیدا کیے جن سے یہاں زندہ انواع کا رہنا ممکن ہوا۔
 ۲۹۔ دنشیرح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، المنل حواشی ۲۳-۲۴۔ جلد چہارم، ایس، حواشی ۲۹-۳۲۔ المؤمن، حواشی ۹۰-۹۱۔ ثم السجدہ، حواشی ۱۳ تا ۱۳۔ الزخزخ، حواشی ۱۰ تا ۱۰۔ الجاثیہ، حاشیہ ۷،
 اللہ یعنی آدمیوں کے لیے دانہ اور جانوروں کے لیے چارہ۔

۲۲۔ اصل میں لفظ آلاء استعمال ہوا ہے جسے آگے کی آیتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے اور ہم نے مختلف مقامات پر اس کا مفہوم مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اس لیے آغاز ہی میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس لفظ میں معنی کی کتنی وسعت ہے اور اس میں کیا کیا مفہومات شامل ہیں۔

آلاء کے معنی اہل لغت اور اہل تفسیر نے بالعموم ”نعمتوں کے بیان کیے ہیں۔ تمام مترجمین نے بھی یہی اس لفظ کا ترجمہ کیا ہے۔ اور یہی معنی ابن عباس، قتادہ اور حن بصری سے منقول ہیں۔ سب سے بڑی دلیل اس معنی کے صحیح ہونے کی یہ ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ وہ اس

آیت کر سن کہ بار بار لایبشی پر صِنِّ نِعْمَتٍ رَبِّنَا نَكْتَابُ كَيْفَ تَقُولُ۔ ہنذا زمانہ حال کے بعض محققین کی اس رائے سے ہیں اتفاق نہیں ہے کہ آلاء نعمتوں کے معنی میں سر سے استعمال ہی نہیں ہوتا۔

دوسرے معنی اس لفظ کے قدرت اور عجائب قدرت یا کمالات قدرت ہیں۔ ابن جریر طبری نے ابن زید کا قول نقل کیا ہے کہ نبای الاء ویکما کے معنی ہیں فیاتی قدرۃ اللہ۔ ابن جریر نے خود بھی آیات ۳۸ کی تفسیر میں آلاء کہ قدرت کے معنی میں لیا ہے۔ امام رازی نے بھی آیات ۱۴-۱۵-۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ آیات بیان نعمت کے لیے نہیں بلکہ بیان قدرت کے لیے ہیں۔ اور آیات ۲۲-۲۳ کی تفسیر میں وہ فرماتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عجائب قدرت کے بیان میں ہے نہ کہ نعمتوں کے بیان میں۔

اس کے تیسرے معنی میں خوبیاں، اوصاف حمیدہ اور کمالات و فضائل۔ اس معنی کو اہل لغت اور اہل تفسیر نے بیان نہیں کیا ہے، مگر اشعار عرب میں یہ لفظ کثرت سے اس معنی میں استعمال ہوا ہے تاہم کہتا ہے :-

هم الملوك و ابناء الملوك لهم فضل على الناس في الآلاء والنعيم
وہ بادشاہ اور شاہزادے ہیں۔ ان کو لوگوں پر اپنی خوبیوں اور نعمتوں میں فضیلت حاصل ہے۔
قہلہل اپنے بھائی کلیب کے مرثیہ میں کہتا ہے :

الحزم والنعيم كانا من طبائعها ما كل آلائه يا قوم احصينها
حزم اور عزم اس کے اوصاف میں سے تھے لوگو، میں اس کی ساری خوبیاں شمار نہیں کر رہا ہوں
فضالہ بن زید القدوانی غریبی کی برائیاں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ غریب اچھا کام بھی کرے تو بریا بنتا ہے اور :

وتحمد آلاء البخیل المدرهم

مادار بخیل کے کمالات کی تعریف کی جاتی ہے

أبدع همدانی اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے :

ورضيت آلاء الكبيت فمن يبيع فردسا فليس جوادا نابعا

تجھ کو کسیت کے عمرہ اوصاف پسند ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی گھوڑے کو بیچتا ہے تو بیچے، ہمارا گھوڑا کینے والا نہیں ہے۔“

خماسہ کا ایک شاعر، جس کا نام ابوقاسم نے نہیں لیا ہے، اپنے ممدوح ولید بن ادہم کے اقتدار کا تشبیہ کہتا ہے:

اذا ما امرتوا شئنا بالاعصیتِ فلا یبعد الله الولید بن ادہما
جب بھی کوئی شخص کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کرے تو خدا نہ کرے کہ ولید بن ادہم اس موقع پر فراموش ہو۔

فما کان مفداحا اذا الخیر متہ ولا کان منانا اذا هو انعمنا
”اس پر اچھے حالات آتے تو چھوٹا نہ تھا اور کسی پر احسان کرتا تو جاتا نہ تھا۔“

کامب یجمع آلاء الفتی نبۃ سید سادات خضم

وہ کامل اور جوانمردی کے اوصاف کا جامع ہے۔ شریعت ہے، سرداروں کا سردار، وریا دل۔ ان شواہد و نظائر کو نگاہ میں رکھ کر ہم نے لفظ آلاء کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہے اور ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے اُس کے جو معنی مناسب تر نظر آتے ہیں وہی ترجیح میں درج کر دیئے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر ایک ہی جگہ آلاء کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اور ترجیح کی مجبوریوں سے ہم کو اس کے ایک ہی معنی اختیار کرنے پڑے ہیں، کیونکہ اردو زبان میں کوئی لفظ اتنا جامع نہیں ہے کہ وہ ان سارے مفہومات کو بیک وقت ادا کر سکے۔ مثلاً اس آیت میں زمین کی تخلیق اور اس میں مخلوقات کی رزق رسانی کے بہترین انتظامات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے رب کے کن کن آلاء کو محبتلاؤ گے۔ اس موقع پر آلاء صرف نعمتوں کے معنی ہی میں نہیں ہے، بلکہ اللہ جل شانہ کی قدرت کے کمالات اور اُس کی صفات حمیدہ کے معنی میں بھی ہے۔ یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے اس کرۂ خاکی کو اس عجیب طریقے سے بنایا کہ اُس میں بے شمار اقسام کی زندہ مخلوقات رہتی ہیں اور طرح طرح کے پھل اور نفلے اس کے اندر پیدا ہوتے

ہیں۔ اور یہ اس کی صفاتِ حمیدہ ہی ہیں کہ اُس نے ان مخلوقات کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں ان کی پرورش اور رزقِ رسانی کا بھی انتظام کیا، اور انتظام بھی اس شان کا کہ ان کی خوراک میں نرمی غذا سبب ہی نہیں ہے بلکہ لذتِ کام و دہن اور ذوقِ نظر کی بھی اُن گنت رعایتیں ہیں۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے صفتِ ایک کمال کی طرف بطور نمونہ اشارہ کیا گیا ہے کہ کھجور کے دھنوں میں پھل کس طرح غلافوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اس ایک مثال کو نگاہ میں رکھ کر ذرا دیکھیے کہ کیلے، انار، منترے، ناریل اور دوسرے پھلوں کے پکیگ میں آرٹ کے کیسے کیسے کمالات دکھاتے گئے ہیں، اور یہ طرح طرح کے غلے اور دالیں اور جُوب، جو ہم بے فکری کے ساتھ پکا پکا کر کھاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو کیسی کیسی نفیس بالوں اور خوشبوں کی شکل میں پیک کر کے اور نازک چھتکوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔

سَلَّم جھٹلانے سے مراد وہ متعدد رویتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی قدرت کے کشتیوں اور اس کی صفاتِ حمیدہ کے معاملے میں لوگ اختیار کرتے ہیں، مثلاً:

بعض لوگ سرے سے یہی نہیں مانتے کہ ان ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض مادے کے اتفاقی ہجماں کا نتیجہ ہے، یا ایک حادثہ ہے جس میں کسی حکمت اور ضاعی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ کھلی کھلی تکذیب ہے۔

بعض دوسرے لوگ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے مگر اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھہراتے ہیں، اُس کی نعمتوں کا شکریہ دوسروں کو ادا کرتے ہیں، اور اس کا رزق کھا کر دوسروں کے گن گاتے ہیں۔ یہ تکذیب کی ایک اور شکل ہے۔ ایک آدمی جب تسلیم کرے کہ آپ نے اُس پر فلاں احسان کیا ہے، اور پھر اسی وقت آپ کے سامنے کسی ایسے شخص کا شکریہ ادا کرنے لگے جس نے درحقیقت اس پر وہ احسان نہیں کیا ہے، تو آپ خود کہہ دیں گے کہ اس نے بدترین احسان فراموشی کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ اس کی یہ حرکت اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ آپ کو نہیں بلکہ اس شخص کو اپنا محسن مان رہا ہے جس کا وہ شکریہ ادا کر رہا ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو ساری چیزوں کا خالق اور تمام نعمتوں کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے

انسان کو اس نے ٹھیکیری جیسے سوکھے مٹھے ہوتے گار سے بنا یا اور جن کو آگ کی

ہیں، مگر اس بات کو نہیں مانتے کہ انہیں اپنے خالق و پروردگار کے احکام کی اطاعت اور اس کی ہدایات کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ احسان فراموشی اور انکارِ نعمت کی ایک اور صورت ہے، کیونکہ جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ نعمت کو ماننے کے باوجود نعمت دینے والے کے حق کو جھٹلاتا ہے۔

کچھ اور لوگ زبان سے نہ نعمت کا انکار کرتے ہیں نہ نعمت دینے والے کے حق کو جھٹلاتے ہیں، مگر عملاً ان کی زندگی اور ایک منکر و مکذیب کی زندگی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا۔ یہ تکذیب بالقول نہیں بلکہ تکذیب بالفعل ہے۔

۱۔ تخلیقِ انسانی کے ابتدائی مراتب جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں ان کی سلسلہ وار ترتیب مختلف مقامات کی تصریحات کو مرجع کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے: (۱) تراب، یعنی مٹی یا خاک (۲) طین، یعنی گارا جو مٹی میں پانی ملا کر بنایا جاتا ہے۔ (۳) طین لازب، لیس دار گارا، یعنی وہ گارا جس کے اندر کافی دیر تک پڑے رہنے کے باعث لیس پیدا ہو جاتے۔ (۴) حما مسنون، وہ گارا جس کے اندر بُو پیدا ہو جائے (۵) صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ کا لُفْحًا، یعنی وہ مٹھا ہوا گارا جو سوکھنے کے بعد پکی ہوئی مٹی کے ٹھیکرے جیسا ہو جاتے۔ (۶) بَشْرَ جَمِیٍّ کی اس آخری صورت سے بنا یا گیا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص روح پھونکی، جس کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا، اور جس کی جنس سے اس کا جڑا پیدا کیا گیا۔ (۷) ثُمَّ جَعَلْنَا نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ۔ پھر آگے اس کی نسل ایک خیر پانی جیسے ست سے چلائی گئی جس کے لیے دوسرے مقامات پر لطفہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

ان مدارج کے لیے قرآن مجید کی حسب ذیل آیات کو ترتیب وار ملاحظہ کیجیے: کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ (آل عمران - ۵۹)۔ بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ الرَّسْمِ ۴۰۔ اِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ (الصافات - ۱۱)۔ چوتھا اور پانچواں مرتبہ آیت زیر تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد کے مراتب ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں: اِنِّیْ خَلَقْتُ بَشَرًا مِّنْ طِينٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدٰتٍ ۷۱- ۷۲۔ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ

نپٹ سے پیدا کیا۔ پس آئے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن عجائب قدرت کو جھٹلاؤ گے؟

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَنَسُوا آلَهُمْ جَعَلْ نَسْلَهُمْ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ قَهْقِينٍ (السجدہ - ۸)۔ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ نُّوعٍ مِّنْ نُّطْفَةٍ (الحج - ۵)

۵۔ اصل الفاظ میں مِنْ مَّارِحٍ تَعْنُ نَارٍ۔ نار سے مراد ایک خاص نوعیت کی آگ ہے نہ کہ وہ آگ

جو ککڑی یا کوئلہ جلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور مارج کے معنی ہیں خالص شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔ اس

ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پہلا انسان مٹی سے بنایا گیا، پھر تخلیق کے مختلف مدارج سے

گزرتے ہوئے اُس کا لبدِ خاکی نے گوشت پرست کے زندہ بشر کی شکل اختیار کی اور آگے اس کی نسل

نطفہ سے چلی، اسی طرح پہلا جن خالص آگ کے شعلے، یا آگ کی نپٹ سے پیدا کیا گیا، اور بعد میں

اس کی ذریت سے جنوں کی نسل پیدا ہوتی۔ اُس پہلے جن کی حیثیت جنوں کے معاملہ میں وہی ہے جو آدم

علیہ السلام کی حیثیت انسانوں کے معاملہ میں ہے۔ جس طرح زندہ بشر بن جانے کے بعد حضرت آدم

اور ان کی نسل سے پیدا ہونے والے انسانوں کے جسم کو اُس مٹی سے کوئی مناسبت باقی نہ رہی جس سے

ان کو پیدا کیا گیا تھا۔ اگرچہ اب بھی ہمارا جسم پورا پورا زمین ہی کے اجزاء سے مرکب ہے، لیکن ان اجزاء

نے گوشت پرست اور خون کی شکل اختیار کر لی ہے اور جان پڑنے کے بعد وہ تودہ خاکی کی بنیت

ایک بالکل ہی مختلف چیز بن گیا ہے۔ ایسا ہی معاملہ جنوں کا بھی ہے۔ اُن کا وجود بھی اصلاً ایک آتشیں

وجود ہی ہے، لیکن جس طرح ہم محض تودہ خاکی نہیں ہیں اسی طرح وہ بھی محض شعلہ آتش نہیں ہیں۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جن مجرد روح نہیں ہیں بلکہ ایک خاص نوعیت

کے مادی اجسام ہی ہیں، مگر چونکہ وہ خالص آتشیں اجزاء سے مرکب ہیں اس لیے وہ خاکی اجزاء سے

بنے ہوئے انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ اسی چیز کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اِنَّ يَدْرِكُهُمْ هُوْدٌ

نَبِيْلَةٌ مِّنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ شَيْطَانٌ اُوْرَاْسٌ كَا قَبِيْلَةٍ ۗ ثُمَّ كُوِيَ اِيْسٰى جَدُّهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَرٰهُمْ ۗ

تم اُس کو نہیں دیکھتے (الاعراف - ۲۷)۔ اسی طرح جنوں کا سریع الحركت ہونا، ان کا بہ آسانی

مختلف شکلیں اختیار کر لینا، اور ان مقامات پر غیر محسوس طریقے سے نفوذ کر جانا جہاں خاکی اجزاء سے

بہی ہوئی چیزیں نفع دہنہیں کر سکتیں، یا نفع دہن کرتی ہیں تو ان کا نفع دہن محسوس ہو جاتا ہے، یہ سب امور بھی اسی وجہ سے ممکن اور قابل فہم ہیں کہ وہ فی الاصل آتشیں مخلوق ہیں۔

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جن نہ صرف یہ کہ انسان سے بالکل الگ نوعیت کی مخلوق ہیں، بلکہ ان کا مادہ تخلیق ہی انسان، حیوان، نباتات اور جادات سے قطعی مختلف ہے۔ یہ آیت صریح الفاظ میں ان لوگوں کے خیال کی غلطی ثابت کر رہی ہے جو جنوں کو انسانوں ہی کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ مٹی سے انسان کو اور آگ سے جن کو پیدا کرنے کا مطلب دراصل دو قسم کے لوگوں کی مزاجی کیفیت کا فرق بیان کرنا ہے، ایک قسم کے انسان منکسر المزاج ہوتے ہیں اور وہی سچے معنوں میں انسان ہیں، اور دوسری قسم کے انسان آتش کے پرکالے اور شعلہ مزاج ہوتے ہیں جنہیں آدمی کے بجائے شیطان کہنا زیادہ صحیح ہوتا ہے۔ لیکن یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ تخریب ہے۔ اور پر حاشیہ نمبر ۱۷ میں ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ قرآن مجید مٹی سے انسان کے پیدا کیے جانے کا مطلب کتنی وضاحت کے ساتھ خود بیان کرنا ہے۔ کیا ان ساری تفصیلات کو ٹپھ کر کوئی معقول آدمی یہ معنی لے سکتا ہے کہ ان ساری باتوں کا مقصد محض اچھے انسانوں کے منکسر المزاج ہونے کی تعریف بیان کرنا ہے؟ پھر آخر یہ بات کسی صحیح العقول آدمی کے ذہن میں کیسے آسکتی ہے کہ انسان کی تخلیق ٹھری ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے کرنے، اور جن کی تخلیق خالص آگ کے شعلے سے کرنے کا مطلب ایک ہی نوع انسانی کے دو مختلف المزاج افراد یا گروہوں کی جداگانہ ابتدائی خصوصیات کا فرق ہے؟ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورہ ذاریات حاشیہ ۵۱۔

۱۷۔ یہاں موقع کی مناسبت سے آلام کے معنی "عجائیب قدرت" زیادہ موزوں ہیں، لیکن اس میں نعمت کا پہلو بھی موجود ہے۔ مٹی سے انسان جیسی، اور آگ کے شعلے سے جن جیسی حیرت انگیز مخلوقات کو وجود میں لے آنا جس طرح خدا کی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے، اسی طرح ان دونوں مخلوقوں کے لیے یہ بات ایک عظیم نعمت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ صرف وجود بخشا بلکہ ہر ایک کی ساخت ایسی رکھی اور ہر ایک کے اندر ایسی قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمادیں جن سے

دونوں مشرق اور دونوں مغرب، سب کا مالک و پروردگار وہی ہے۔ پس اسے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟

یہ دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ اگرچہ جنوں کے متعلق ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہیں، مگر انسان تو ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کو انسانی دماغ دینے کے ساتھ مچھلی یا پرندے یا بندر کا جسم دے دیا جاتا تو کیا اس جسم کے ساتھ وہ اس دماغ کی صلاحیتوں سے کوئی کام لے سکتا تھا؟ پھر کیا یہ اللہ کی نعمتِ عظمیٰ نہیں ہے کہ جن قوتوں سے اس نے انسان کے دماغ کو سرفراز فرمایا تھا ان سے کام لینے کے لیے موزوں ترین جسم بھی عطا فرمایا؟ یہ ہاتھ، یہ پاؤں، یہ آنکھیں، یہ کان، یہ زبان اور یہ قامتِ راست ایک طرف، اور یہ عقل و شعور، یہ فکر و خیال، یہ قوتِ ایجاد و قوتِ استدلال، اور یہ صناعتی و کاریگری کی صلاحیتیں دوسری طرف، ان دونوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہو گا کہ بنانے والے نے ان کے درمیان غایت درجے کی مناسبت رکھی ہے جو اگر نہ ہوتی تو دنیا میں انسان کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ پھر یہی چیز اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حمیدہ پر بھی دلالت کرتی ہے۔ آخر علم، حکمت، رحمت اور کمال درجہ کی قوتِ تخلیق کے بغیر اس شان کے انسان اور جن کیسے پیدا ہو سکتے تھے؟ اتفاقی حوادث اور خود بخود کام کرنے والے اندھے بہرے قوانینِ فطرتِ تخلیق کے یہ معجزے کیسے دکھا سکتے ہیں؟

۱۷۔ دو مشرقوں اور دو مغربوں سے مراد جاڑے کے چھوٹے سے چھوٹے دن اور گرمی کے بڑے سے بڑے دن کے مشرق و مغرب بھی ہو سکتے ہیں، اور زمین کے دونوں نصف کرہوں کے مشرق و مغرب بھی۔ جاڑے کے سب سے چھوٹے دن میں سورج ایک نہایت تنگ زاویہ بنا کر طلوع و غروب ہوتا ہے، اور اس کے برعکس گرمی کے سب سے بڑے دن میں وہ انتہائی وسیع زاویہ بناتے ہوئے نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہر روز اس کا مطلع اور مغرب مختلف ہوتا رہتا ہے جس کے لیے ایک دوسرے مقام پر قرآن میں رَيْبُ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ وَالْفَارِجِ۔۔۔ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح زمین کے ایک نصف کرے میں جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے

دوسمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔^{۱۹} پس اسے جن وانس، تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کہتموں کو جھلاؤ گے؟

اسی وقت دوسرے نصف کرے میں وہ غروب ہوتا ہے۔ یوں بھی زمین کے دو مشرق اور دو مغرب بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان دونوں مشرقوں اور مغربوں کا رب کہنے کے کئی معنی ہیں۔ ایک یہ کہ اسی کے حکم سے سورج کے طلوع و غروب اور سال کے دوران میں ان کے مسلسل بدلتے رہنے کا یہ نظام قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ زمین اور سورج کا مالک و فرمانروا وہی ہے، ورنہ ان دونوں کے رب الگ الگ ہوتے تو زمین پر سورج کے طلوع و غروب کا یہ باقاعدہ نظام کیسے قائم ہو سکتا تھا اور دائماً کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک و پروردگار وہی ہے، ان کے درمیان رہنے والی مخلوقات اسی کی ملک ہیں، وہی ان کو پال رہا ہے، اور اسی پرورش کے لیے اُس نے زمین پر سورج کے ڈوبنے اور نکلنے کا یہ حکیمانہ نظام قائم کیا ہے۔

۱۹۔ یہاں بھی اگرچہ موقع و محل کے لحاظ سے آلاء کا مفہوم "قدرت" زیادہ نمایاں محسوس ہوتا ہے، مگر ساتھ ہی "نعمت" اور "صفات حمیدہ" کا پہلو بھی اس میں موجود ہے۔ یہ بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کے طلوع و غروب کا یہ قاعدہ مندر کیا، کیونکہ اس کی بدولت فصلوں اور موسموں کے وہ تغیرات باقاعدگی سے رونما ہوتے ہیں جن سے انسان و حیوان اور نباتات سب کے لیے شمار مصالح فائزہ ہیں۔ اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت اور حکمت ہی تو ہے کہ اس نے جن مخلوقات کو زمین پر پیدا کیا تھا ان کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی قدرت سے یہ انتظامات کر دیئے۔

۱۹۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، سورہ فرقان حاشیہ ۶۸۔